ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

ڈاکٹر اسما امانت
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ اسلامیہ گریجویٹ کالج برائے خواتین، لاہور کینٹ، لاہور
ڈاکٹر عاشق حسین
ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (کالجز)، پنجاب، لاہور

انتظار حسین کے افسانوں میں پاکستانیت

Dr. Asma Amanat
Assistant Professor, Govt. Graduate Islamia College for Women, Lahore Cantt, Lahore.
Dr. Ashiq Hussain
Director Public Instruction (Colleges), Punjab, Lahore

Pakistaniat in Intizar Hussain's Short Stories

Intizar Hussain was a patriotic writer. Love for Pakistan was a key reference in his creative thinking. He has given prominence to his patriotism in his fictions that most of his characters were immigrants who were wandering in search of their cultural identity. They also remember the land they left behind and are busy building a relationship with the new land. But the law-and-order situation in Pakistan, chaos, riots, rallies and political instability was also a cause of concern for them. The tragedy was that the local people could not establish a Jewish-Christian brotherhood with the refugees. Thus, the Holy Land remained different from the world of their dreams and hopes. This is the problem of Intizar Hussain and his characters.

Keywords: *Pakistaniat, Intizar Hussain, Fiction, Short Stories, Literature.*

انتظار حسین ایک حب الوطن ادیب تھے۔ پاکستان سے محبت ان کی تخلیقی فکر کا کلیدی حوالہ تھی۔ اپنی حب الوطنی کو انہوں نے اپنے افسانوں میں نمایاں جگہ دی ہے کہ ان کے زیادہ تر کردار مہاجر تھے جو اپنی تہذیبی شناخت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ انہیں چھوڑی ہوئی زمین کی یاد بھی ستاتی ہے اور نئی زمین سے رشتہ استوار کرنے میں بھی مصروف عمل ہیں۔ مگر پاکستان میں امن وامان کی ابتر صورت حال، انتشار، ہنگامے، جلسے جلوس اور سیاسی عدم استحکام بھی ان کے لئے باعث تشویش تھا۔ المیہ یہ بھی تھا کہ مقامی لوگ مہاجرین سے یہود و نصاریٰ والا

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

بھائی چارہ قائم نہ کر سکے۔یوں پاک سرزمین ان کے خوابوں اور امیدوں کی دنیا سے مختلف رہی۔ یہی فکر انتظار حسین اور ان کے کرداروں کا مسئلہ ہے۔

ادیب اسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے جس میں رہ کر اور جس کے لیے وہ ادب تخلیق کرتا ہے نیز ادیب کے فکر و کردار کی تشکیل بھی اس معاشرے کی ثقافت ہی کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ادیب اسی ماحول میں رہتا ہے اسی کو سیکھتا ہے اور انہی ثقافتی اقدار کے مطابق اپنا ردِ عمل ظاہر کرتا ہے جو اس کی ثقافت نے متعین کر رکھی ہیں۔ گویا وہ معاشرے میں ثقافت کی قائم کردہ مذہبی، سماجی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی حدود میں مقید ہوتا ہے۔ وہ انہی حدود کو اپنی آزادی تصور کرتے ہوئے زندگی گزارتا ہے مگر ادب تخلیق کرتے وقت وہ ان حدود سے باہر جا سکتا ہے کہ ادب تخیل کی پرواز ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ وہ ثقافت سے باہر کی دنیا کی حقیقت نگاری تو کر سکتا ہے مگر اُس کی حمایت نہیں کر سکتا، اُسے برتر نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس حوالے سے عارف عبدالمتین کا اپنے مضمون "ادیب اور حب وطن کا مسئلہ" میں کہنا ہے کہ:

> "وہ (ادیب) اس دھرتی سے اپنے پیار کی آئینہ داری سے باز نہیں رہ سکتا۔ جس پر اُس کے خالق اپنی اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ ہر ادیب جس خطہ ارض سے وابستہ ہوتا ہے، اس کی ایک ایک شے اس کے رگ وپے میں ان گنت غیر مرئی ہیولوں کا روپ دھار کر پیوست ہو گئی ہوتی ہے اور اشیا کی یہ پیوستگی اُس کے وجدان و آگہی کو ہر لمحہ متحرک کرتی رہتی ہے اور یہی تحرک اُس کے ہاں تخلیق فن کا موجب بنتا رہتا ہے لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادیب چاہے نہ چاہے، اس صورت حال کا شعور رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، وہ حبِ وطن کو اپنی نگارشات میں مختلف (Shades) کے ساتھ منعکس کرنے پر مجبور ہے"۔[1]

انتظار حسین (۱۹۲۴۔۲۰۱۶ء) پاکستانیت کے حوالے سے اہم افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُن کے مجموعوں گلی کوچے (۱۹۵۲ء)، کنکری (۱۹۵۵ء)، آخری آدمی (۱۹۶۷ء)، شہر افسوس (۱۹۷۲ء) کچھوے (۱۹۸۱ء)، خیمے سے دور (۱۹۸۶ء)، خالی پنجرہ (۱۹۹۳ء)، میں پاکستانیت کے حوالے سے متعدد افسانے ملتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہجرت و فسادات سے لے کر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے عصری مسائل، ضعیف الاعتقادیاں یہ تمام تاریخی، سیاسی، عسکری، ثقافتی اور سماجی مسائل پاکستانیت کے تناظر میں افسانوں کا حصہ بنے ہیں۔ اُن کے "قیوما کی دکان"، "خرید و حلوہ بیسن کا"، "فجا کی آپ بیتی"، "ایک بن لکھی رزمیہ"،

"استاد"، "رہ گیا شوق منزل مقصود"، "وہ جو کھوئے گئے"، "اندھی گلی"، "شہر افسوس"، "ہندوستان سے ایک خط"، "سوت کے تار"، "سیکنڈ راؤنڈ"، "دوسرا راستہ"، "اسیر"، "نیند"، "شور"، "کانا دجال" اور "شرم الحرم"، جیسے معروف افسانے اس حوالے سے قابلِ ذکر ہیں۔

انتظار حسین کا نام پاکستانیت کے حوالے سے مصدقہ و مسلمہ ہے۔ اگرچہ کچھ ناقدین ان کی ماضی پرستی کی وجہ سے انھیں پاکستانی روایات کا امین خیال کرنے سے گریزاں ہیں مگر انتظار حسین کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی انھیں بجا طور پر نئے طرز احساس کا نمائندہ تصور کرتے ہوئے ادیبوں کے جس گروہ میں شامل کرتے ہیں وہ پاکستانی ادب کی نئی روایت کا علم بردار ہے:

> "برصغیر کے مسلمانوں کی تقریباً ایک ہزار برس پرانی روایت طرز احساس کے نئے سانچوں کے لیے محرک ہو سکتی ہے اور محض اس طرح پاکستانی ادب کی نئی روایات پیدا ہو سکتی ہے۔"(۲)

انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں پاکستانیت کو تحریک پاکستان، فسادات اور ہجرت کے حوالے سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ان کے بیش تر افسانے کرداروں کے اُس ملال و تاسف اور جڑوں سے اکھڑنے کے دکھ کو بیان کرتے ہیں جو ہجرت کی صورت میں مہاجرین کو سہنا پڑا۔ اسی حوالے سے "قیوما کی دکان"، "خریدو حلوہ بیسن کا"، "چوک"، "فجا کی آپ بیتی"، "اجودھیا"، "رہ گیا شوق منزل مقصود"، "ایک بن لکھی رزمیہ" اور "استاد" جیسے افسانے اہم ہیں۔ "بن لکھی رزمیہ" وہ شاہ کار افسانہ ہے جس کو کم و بیش تمام ناقدین نے سراہا ہے۔ "بن لکھی رزمیہ" ایک ہمہ گیر افسانہ ہے جو فسادات کے مکمل پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اس پایہ کی تخلیق اسی وقت ممکن ہے جب فسادات کو ایک وسیع سیاسی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ پیش کیا جائے اور ایک پوری قوم کا تجربہ سمویا جائے۔"(۳) افسانوں میں ہجرت کا کرب محض اختتام پر بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کی کہانی میں کرداروں کا اپنی زمین میں پیوست ہونا بتایا گیا ہے کہ ہجرت کیسے کیسے کرداروں کو بے وطن کر گئی۔ "بن لکھی رزمیہ" میں قادر پور کے رہائشی کردار پچھوا کا جذبہ پاکستانیت دکھایا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے پچھوا کو ۱۹۴۷ء کے بعد کس طرح اپنے اس جذبہ ملّی کو بچانا محال ہوا افسانہ نگار نے قیامِ پاکستان کے ابتر حالات کے تناظر میں اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ پاکستان کے لیے سرگرمِ عمل ہے مگر جب پاکستان اُس کی کوششوں کے بغیر ہی بن گیا تو اس حسرت میں مبتلا ہو گیا کہ وہ پاکستان کے لیے کچھ کر نہ سکا: "پاکستان بننے کی اطلاع جب اسے ملی تو وہ بہت سرد ہوا۔ بڑی حسرت سے

ہاتھ مل کر کہنے لگا "میاں ہم بیٹھے ہی رہ گئے اور واہ قلعہ فتح ہو گیا۔" (۴) مگر دوسرا المیہ یہ ہوا کہ پچھوا کا قادر پور پاکستان کی سرحد سے باہر ہی رہا۔ یہاں پچھوا جیسا سادہ لوح کردار یہ سمجھنے سے معذور رہا کہ قادر پور پاکستان میں شامل کیوں نہیں ہے۔ وہ قادر پور میں پاکستان کا پرچم لہرانا چاہتا تھا نہ لگا سکا۔ یہاں سے پچھوا کے جذبہ حب الوطنی کو پہلا دھچکا لگا۔

انتظار حسین کے مطابق قیامِ پاکستان سے کڑا امتحان استحکامِ پاکستان تھا کہ تمام ابن الوقت لوگ پاکستان کے انتظامی امور میں شامل ہو چکے تھے۔ نعیم بھی ایسا ہی کردار تھا جو چپکے سے ہجرت کرتا ہے اور پاکستان میں آکر اعلیٰ عہدوں تک رسائی حاصل کرتا ہے مگر جب پچھوا ہجرت کر کے آتا ہے تو اُس کا یہی جذبہ حبِ وطن نعیم جیسے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ یہاں اُسے زندگی گزارنے کی بنیادی ضروریات روٹی اور چھت کے لیے بھی اپنی کردار کی عظمت کا سودا کرنا پڑا مگر وہ ابھی تک ان مفاد پرست کرداروں کو پاکستان کا حب الوطن عنصر تصور کرتا ہے۔

یہ کردار جو ہجرت کا کرب سہہ کر یہاں تک آئے تھے، جو پاکستان کی سرزمین سے موزونیت و مناسبت پیدا کرنے کی کوششوں میں اپنے کردار کی عظمتوں کو داؤ پر لگائے بیٹھے تھے۔ انھیں جب اس حقیقت کا علم ہوا کہ پاکستان میں ان کے لیے گنجائش نہیں ہے اس لیے ان کو واپس ہندوستان لوٹنا پڑے گا تو خود سوچیے کہ ان حب الوطن کرداروں پر کیا بیتی ہو گی:

> "میاں یہ کیسا حکم آیا ہے" پچھوا کو جلال آرہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ میری بوٹیاں چاب ڈالے گا۔ میں کانپ گیا..... کیسا حکم" پچھوا نے تڑخ کر کہا۔ "یہی حکم ہے کہ جو جو مہاجرین آیا ہے وہ پھر اپنی ایسی تیسی کرا کے ہندوستان چلا جائے۔"(۵)

آخر کار پاکستان کی زمین پچھوا جیسے لوگ پر تنگ ہوتی گئی۔ یاد رہے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اس سے بیش تر ہندوستان کی زمین تنگ ہوئی تھی۔ جب ان کرداروں کو کہیں اماں نہ ملی تو ناچار یہ واپس لوٹ گئے۔ پاکستان کا یہی المیہ تھا کہ ابن الوقت لوگ حاکم بن بیٹھے اور حب الوطن لوگوں کی ایک نہ چلی۔ کچھ راستوں میں انسان پیچھے دیکھے تو پتھر کا بن جاتا ہے ہجرت بھی ایسا ہی راستہ تھا جہاں پیچھے نظر ڈالنے والے پتھر کے بن گئے:

> "تمہارے وطن میں پچھوا کے لیے جگہ نہ تھی لیکن اس پرانے وطن کی دھرتی نے اسے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ میں اس نصیب ور شخص سے مل نہ سکا۔ ہاں ایک روز جب ساری بستی میں

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی میں نے دیکھا کہ عید گاہ والے پیپل کی جس شاخ پر کلوا اور ممد نے اپنی پارٹی کا جھنڈا باندھا تھا وہاں اب ان کے سردار (بچھوا) کا سر لٹک رہا ہے۔" (۶)

ممتاز شیریں اس افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی تنقیدی تصنیف معیار میں لکھتی ہیں:

"بن لکھی رزمیہ میں ایک 'بڑا پن' پایا جاتا ہے۔ بیس بائیس صفحوں کے اس افسانے میں اتنی تہیں ہیں اور اتنے پہلو سموئے گئے ہیں کہ اس کی گرفت میں ایک دور سمٹ آیا ہے۔ مسلمانوں کی پاکستان کے تصور ہی سے والہانہ جذباتی وابستگی، فسادات کے دوران میں افراتفری کی تیاری کے باوجود دشمنوں سے دلیرانہ مقابلہ لیکن پاکستان بننے کے بعد اچانک ہندی مسلمانوں کی شکست خوردگی، جوش، ولولہ، امیدیں پھر تلخیاں اور مایوسیاں، الوژن اور ڈژالوژن، یہ ساری مسلمان قوم ہی کا تجربہ تھا۔" (۷)

ہجرت سے قبل یہ لوگ ہندوستان کی زمین میں یوں پیوست تھے کہ مانو جیسے انگوٹھی میں نگینہ، "قیوما کی دکان" کا قیوما، "خرید و حلوہ بیسن کا" میں بجی جان کا خاندان، "فجا کی آپ بیتی" کا فجا، "اجودھیا" کا وہ، "رہ گیا شوقِ منزل مقصود"، کا اماں جی کا خاندان اور استاد میں استاد کے ساتھی" یہ تمام کردار وہ تھے جن کو لمحوں میں بسا بسایا گھر چھوڑنا پڑا۔ ان افسانوں میں بھی انتظار حسین نے پاکستان کے چند عاقبت نا اندیشوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ تمام افسانے قریب ۱۹۵۰ء کے آخر تک کے ہیں۔ اس دوران ہجرت، فسادات کے موضوعات ہی ادب پر چھائے رہے۔ اس لیے ان افسانوں کا محور و مرکز بھی یہی دو موضوعات تھے۔

"اجودھیا" کے مرکزی کردار کو ریوڑیاں کھانے کی لت پڑی ہے۔ اُسے پاکستان میں کہیں سے بھی اپنی پسند کی ریوڑیاں نہیں ملتی اُس نے ہندوستان کے دوست رمیش سے ریوڑیاں منگوانے کا سوچا مگر پھر اس وجہ سے اس خیال کو رد کر دیا ہے کہ:

"پھر اس کی قومی غیرت نے جوش مارا، نہیں جی گولی مارو۔ رمیش سوچے گا کہ سالا بڑا گیا تھا پاکستان۔ روٹی کپڑا الگ رہا، ریوڑی کے دانے کو محتاج ہو گیا۔ ابھی دیکھا کیا ہے ابھی تو معلوم پڑے گی۔ بیٹا کی طبیعت ہری ہو جائے گی۔" (۸)

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

یہ تمام کردار جو مہاجر بننا نہ چاہتے تھے انھیں فسادات کی اندھی آگ نے مہاجر بننے پر مجبور کیا۔ انتظار حسین نے اس رویے کو اماں جی کے کردار سے واضح کیا ہے۔ وہ کسی قیمت گھر چھوڑنے پر تیار نہیں تھیں۔ اُس پر مشن کا یہ پوچھنا کہ:

> "باوا پاکستان میں چل کے قطب صاحب کی لاٹھ دیکھیں گے۔ افو میاں بولے کہ "بیٹا قطب صاحب کی لاٹھ پاکستان میں نہیں ہے وہ تو دلی میں ہے۔ اچھا باوا تاج بی بی کا روضہ دیکھیں گے۔ مشن نے ہاتھ کے ہاتھ دوسرا تیار کر ڈالا۔ لیکن افو میاں نے پھر ٹکا سا جواب دے دیا۔ ابے تاج بی بی کا روضہ آگرہ میں ہے۔ تو باوا پاکستان میں کیا ہے۔ اور افوہ میاں بڑے پیار سے بولے۔ "بیٹا پاکستان میں قائداعظم ہیں۔" (۹)

فسادات کے حوالے سے انتظار حسین کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر نعیم نقوی اپنی تصنیف تنقید و تناظر میں لکھتے ہیں:

> "انھوں نے ہجرت کے مختلف گوشوں کو نہایت دیانت داری اور ذہانت و پرکاری سے پیش کیا ہے۔ "رہ گیا شوق منزلِ مقصود" ایسے افسانوں میں سے ایک ہے جس میں انتظار حسین نے ہجرت کے واقعات کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ افو میاں جو تحریکِ پاکستان کے حامی تھے اور انھوں نے دور دور تک پھیلی ہوئی فرقہ وارانہ نفرتوں کا عمیق جائزہ لیتے ہوئے پاکستان ہجرت کرنے کا عزم کیا۔ اُس وقت اُن کا چھوٹا سا بچہ عجیب سوالات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے باوا پاکستان میں چل کر قطب مینار کا لاٹھ دیکھیں گے....." (۱۰)

"وہ جو کھوئے گئے" میں چار لوگ (زخمی سر والا، باریش آدمی، تھیلے والا آدمی اور نوجوان، غالباً ہجرت کا خونی دریا پار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے مگر جب گنتی کر کے خود کو پورا کرنا چاہا تو ایک ہم سفر کم پڑ گیا۔ حقیقت میں گنتی کرنے والا خود کو شمار نہیں کرتا۔ اسی معمے کو حل کرنے کے لیے وہ اپنا گھروں سے نکلنا یاد کرتے ہیں۔ انتظار حسین کا مخصوص انداز ہے کہ وہ اپنے موضوع کو ذرا علامتی یا اشاراتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہاں بھی ہجرت کے حوالے سے محض یہی بتایا ہے کہ تھیلے والے آدمی کا گھر جل رہا تھا۔ نوجوان کا والد جائے نماز پر بیٹھا تسبیح پڑھ رہا تھا اور زخمی سر والا اسی ہجرت کے سانحے میں زخمی ہوا تھا مگر اُس کے باوجود یہ کردار ماضی کو بھولنے پر مصر ہیں کہ زخمی سر والا افسردگی سے یہ کہتا ہے: "میں اب اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لیے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہاں آباد سے نکلا ہوں یا بیت المقدس سے اور یا کشمیر سے" (۱۱) اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ ماضی کو یاد کرنا بے مصرف ہے مگر انتظار حسین کے کرداروں کا المیہ یہ ہے کہ وہ مستقبل پر نظر نہیں رکھتے، حال سے مطمئن نہیں ہیں اور مستقبل سے مایوس ہیں۔

افسانے "شہر افسوس" میں فسادات کے دوران جس ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا گیا عورتوں کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوا اُسے موضوع بنایا گیا ہے کہ ان کڑے وقتوں میں رشتوں کا لحاظ رہا نہ انسانیت کا پاس۔ انسانیت مر گئی مگر انسان زندہ رہا اور اس درندگی میں جب اُس کے منہ پر تھوکا گیا وہ تب مرا، اس لیے کہ فسادات میں انسانوں کو بھیڑیوں کی ہم نوائی کی جب احساس ہوا تو چہ معنی است؟ ان لوگوں کا المیہ بھی یہی تھا کہ یہ اپنی زمین سے بچھڑ چکے تھے اور "جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انھیں قبول نہیں کرتی۔" (۱۲) گویا "شہر افسوس" اس نگر کو کہا گیا جہاں سے یہ لوگ نکالے گئے، افسانے میں دو کردار جو مر چکے ہیں وہ اپنے مرنے کی روداد سناتے ہیں، اس داستان کے مطابق انسان نہیں مرے تھے دراصل انسانیت مری تھی۔ تیسرا کردار لاپتا ہے اور اپنی شناخت کا متلاشی ہے۔ یہ افسانہ علامتیت کے پردے میں پاکستانیت کے تاریخی و سیاسی واقعے ہجرت اور فسادات کا عمدہ اظہار ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان اس افسانوی مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی تصنیف مضامین و مکالمات میں لکھتے ہیں:

> "شہر افسوس کی تصویریں ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے والوں کی تصویریں ہیں یا پھر ان لوگوں کی تصویریں ہیں جو اس تصادم جدل کی وجہ سے اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اس طرح شہر افسوس مہاجرت کی دنیا بھی ہے۔ زمین کیسے آدمی کی دشمن بنتی ہے۔ آدمی اپنی زمین سے کیسے اکھڑتا ہے اور اکھڑے ہوئے آدمی کی پناہ گاہ کہیں ہے بھی یا نہیں۔ یہ کہانیاں انہی سوالوں کی گونج پیدا کرتی ہیں۔" (۱۳)

افسانہ نگار کے مطابق پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ عوام میں ۱۹۴۷ء سے پہلے جو قومی و ملی جذبہ تھا وہ ۱۹۴۷ء کے بعد اُس جوش و خروش سے پاکستانیت میں ڈھلنے میں ناکام رہا۔ احتجاجی جلسے، ہڑتالیں، جلاؤ گھیراؤ، پتھراؤ جیسے عناصر نے عوام کو بے سکونی، باطنی خلفشار میں مبتلا کیے رکھا۔ افسانہ "دوسرا راستہ" ایوب خانی عہد کے سیاسی جبر اور بے حرمتی کا احساس لیے ہوئے ہے۔ (۱۴) افسانے میں ڈبل ڈیکر بس کی بالائی منزل پر سفر کرتے چند مسافر اور اُن کے مکالمے غور طلب ہیں۔ یہ کردار مختلف حوالوں سے پاکستانیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ کتبہ بردار شخص ایک سچا اور مخلص پاکستانی ہے جو بس میں مسافروں کو اسلامی روایات اور پاکستانی حقائق میں موجود تضادات بتاتے ہوئے اپنا

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

نصب العین کچھ یوں بتاتا ہے۔ "میرا نصب العین..... مسلمان حکومت کے پیچھے جمعہ ادا کرنا۔" (۱۵) اسلامی روایت کے جن واقعات کا یہ کردار تذکرہ کرتا ہے اُن میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا چھنے ہوئے آٹے کی روٹی دیکھ کر گریہ کرنا، حضرت عمر فاروقؓ کا دو چادروں سے کرتہ سلوانے پر لوگوں کا اُن سے جواب طلب کرنے کا قصہ، حضرت علیؓ کا ایرانی قالین ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور حضرت ابوذر غفاریؓ کا دارالامارۃ میں دیباو حریر دیکھ کر گریہ کرنا، اگر غور کیا جائے تو یہ تمام واقعات دراصل اسلامی اصولوں سے منحرک ہونے کے واقعات تھے۔ اگر حضرت عمر فاروقؓ سے جواب طلب کیا جاسکتا ہے تو پھر آج کے حکمران احتساب، انصاف جیسے تقاضوں سے ماورا کیوں ہیں؟: "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انتظار حسین کے افسانوں کے بنیادی طور پر صرف دو موضوعات ہیں۔ (۱) "انسان کا روحانی و اخلاقی زوال (۲) اپنی تہذیبی شخصیت کی تلاش" (۱۶) باقی کردار ظفر، امتیاز، بیگ والا شخص، ثقہ آدمی، اچکن والا یہ کردار حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے تشویش ناک صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ چیل کا جھپٹا مار کر خوان گرانا اور خواب میں بندر کا ساری روٹیاں لے جانا اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ پاکستان میں اشیائے صرف کی بڑھتی ہوئی قیمتیں لوگوں میں بھوک اور افلاس تقسیم کر رہی ہیں۔ اس افسانوی مجموعہ میں جھلکتی پاکستانیت کو ڈاکٹر شفیق انجم نے بھی محسوس کیا ہے۔ اپنی کتاب اُردو افسانہ میں لکھتے ہیں:

> "شہر افسوس کے افسانوں میں بھی یہی (لاحاصل کا کرب اور کچھ پا کر کچھ نہ پانے کی کیفیت) کرب ملتا ہے۔ یہ اپنی زمین سے نکلے ہوؤں کی کہانی ہے۔ انتظار حسین نے اس بستی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں رمزیت کے باوجود ایسے عناصر موجود ہیں۔ جو پاکستانی معاشرے پر دلالت کرتے ہیں۔" (۱۷)

افسانے "ہندوستان سے ایک خط" میں ایک ایسے خاندان کی داستان بیان کی گئی ہے جن کے افراد پاکستان کے حصول کی راہ میں مارے گئے یا اس کی سلامتی کے لیے راہی ملک عدم ہوئے۔ اس خاندان کے جو افراد رہ گئے ہیں وہ اپنے شجرہ نسب سے بیگانے ہیں اور اپنی اخلاقی اقدار کو فراموش کیے بیٹھے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ پاکستان ہم نے بہت سی قربانیوں اور آزمائشوں کے بعد حاصل کیا اور اس کے استحکام کے راستے میں بھی بہت سی آزمائش آچکی ہیں۔

پاکستان کو اپنے قیام کے بعد متزلزل سیاسی صورتِ حال کا سامنا رہا اسی وجہ سے ڈکٹیٹر شپ کا پودا جمہوریت سے زیادہ برگ و بار لایا۔ ایوب خان کے دورِ اقتدار میں پاکستان کے سوشلسٹ ہونے کی افواہ سازی ہوئی

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

اور قادیانیوں کو آئین میں غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ بھی ہوا۔ نیز پاکستان جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا وہاں لوگوں نے اسلامی طرزِ حیات کو اپنانے کے بجائے جدیدیت کی روش کو اختیار کیا۔ اسلام جیسے مثالی نظام کو چھوڑ کر مغرب کی نقالی کرنا افسانہ نگار کو ایک غیر صحت مندانہ طرزِ عمل محسوس ہوا۔ اس لیے وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"پاکستان میں جا کر ہمارے خاندان کی لڑکیاں زیادہ آزاد ہوئی ہیں۔ میں تو جس لڑکی کے متعلق سنتا ہوں کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔" (۱۸) افسانے میں قیامِ پاکستان کے بعد جو تعمیری قوتوں میں صرف کرنے کا زریں وقت تھا اُسے ہم نے نقالی، بے راہ روی، مہنگائی اور اخلاقی اقدار کی پامالی جیسے تخریبی رویوں کی نظر کر دیا۔ اس حوالے سے افسانے میں جس صورتِ حال کی عکاسی کی ہے وہ خاصی مایوس کن سہی مگر کسی حد تک حقیقت ہے۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی انتظار حسین کے افسانوں کو سراتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "۴۷ کے بعد لکھے جانے والے افسانوں میں ان کے افسانے ایک ایسی دستاویز کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں جس میں تقسیم سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت، بے کلی، بے چینی، بے سمتی قلم بند کی گئی ہے۔" (۱۹)

انتظار حسین نے پاکستانیت کو ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگ کے تناظر میں ابھارنے کی کوشش بھی کی ہے مگر وہ ان دونوں جنگوں کو افرادِ قوم کے تناظر میں دیکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔ اُن کے افسانے "سوت کے تار" اور "سیکنڈ راؤنڈ" میں اس احساس کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جنگ کو غلط وقت پر ختم کیا گیا۔ سیز فائر کا فیصلہ عوام کو پسند نہ آیا تھا۔ جنگ کو اس لمحے ختم کرنے کو افسانہ نگار نے ایک ایسی کاوشیں متصور کیا ہے کہ جیسے "اُس عورت کی مانند مت ہو جانا جو اپنے کاتے ہوئے سوت کو مضبوط ہو جانے کے بعد تار تار کر دیا کرتی تھی۔" (۲۰) جنگ بھی سوت کاتنے جیسا عمل ہے جس میں شہادتوں اور قومی جذبوں کے دھاگوں سے بٹ کر فتح تیار ہوتی ہے۔ یہ فتح پاکستان کو مل رہی تھی۔ ہم دشمن پر غالب تھے، اُن کے علاقوں پر قبضہ بھی کر چکے تھے کہ اچانک امریکا کی دخل اندازی سے پاکستانی حکومت سیز فائر کے فیصلے پر رضامند ہو گئی۔ ادھر پاکستان کے عوام جو پاکستان کی فتح پر مسرور تھے دشمن کو مزید سبق سکھانا چاہتے تھے انھیں یہ سیز فائر کا فیصلہ کسی طور مناسب محسوس نہ ہوا تھا۔ اس اظہار برہمی کو انتظار حسین ایک تانگے والے کی زبانی بیان کرتے ہیں جو سیز فائر کے بعد جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "جنگ کھیڈ نہیں ھندی زنانیاں دی۔" (۲۱) گویا عوام اپنے حکمرانوں اور افواج کے اس فیصلے سے اس حد تک مایوس ہوئے کہ جنگ کی ساری کاوشیں، جذبے اور شہادتیں بے مول بکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جس سے لوگوں کے جذبۂ حب الوطنی کو ٹھیس

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

پہنچی۔ یہ فیصلہ انھیں اپنی موت کے مترادف لگا۔ کچھ ایسے ہی مایوسانہ رویے کا اظہار افسانے "سیکنڈ راؤنڈ" میں ملتا ہے۔ افسانے میں تین دوست اشاراتی انداز میں جنگ کے یوں ختم ہو جانے پر متاسف ہیں اور جنگ کے سیکنڈ راؤنڈ کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں ابہام کا شکار ہیں مگر لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ سیکنڈ راؤنڈ ہو جائے۔ اس لیے سوٹ بوٹ والا شخص جنگ کے سیکنڈ راؤنڈ کی اس لیے مخالفت کرتا ہے کہ اس جنگ سے ملک کے ترقیاتی منصوبوں پر اچھا نہیں پڑے گا تو لوگ اس شخص کو برا بھلا کہتے اور "امریکا کا پٹھو" تصور کرتے ہیں۔ افسانے میں کرداروں کا خیال ہے کہ اگر انسان کسی راستے پر پڑ جائے تو پھر اُسے نہ تو وہ راستہ چھوڑنا چاہیے نہ بیچ میں رکنا چاہیے جیسے پاکستان نے جنگ کا آغاز کیا تو پھر اسے حتمی انجام تک پہنچانا بھی چاہیے تھے۔

انتظار حسین کو ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ جیسے المیے نے بھی خاصا متاثر کیا ہے۔ "اسیر"، "نیند"، اور "شور" جیسے افسانوں میں اس پر قلم اٹھایا ہے۔ اس حقیقت میں شک نہیں کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ اور سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں ہندو ذہنیت کار فرما تھی۔ جس نے ہمارے ہی ہم وطنوں کو پاکستان کے خلاف اقدامات کرنے پر اکسایا مگر اس ہندو ذہنیت کو کچھ مقامی لوگ بھی اپنائے ہوئے تھے جو ان کی مدد کر رہے تھے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس المیے کی تشکیل میں ہمارا اپنا قصور بھی تھا۔ مغربی پاکستان والے قومی احساسات کے ناطے بنگالیوں کو وہ مقام و مراعات دینے سے گریزاں تھے جو اپنے لیے جائز تصور کرتے تھے۔ یوں زمینی فاصلے قلبی فاصلوں سے ضرب کھا کر حاصل جمع ہوتے گئے۔ اس لیے زیدی کہتا ہے کہ "ہاں ہم پچیس سال تک ان کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے اس کے بعد یہ یہی کرنا چاہیے تھا۔" (۲۲)

اسی طرح افسانے "اسیر" میں ایک کردار جو بنگلہ دیش سے بچ کر آیا ہے یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ پاکستان میں ابھی بھی "ہڑتالیں، تالہ بندی، جلسے، جلوس، مار دھاڑ، طلبا کے ہنگامے، گرفتاریاں" (۲۳)

انتظار حسین نے محض ملکی حوالے سے ہی پاکستانی فرد کی انفرادیت اور شناخت کی کوشش نہیں کی بل کہ وہ اسے ملتِ اسلامیہ کا فرد تصور کرتے ہوئے اپنے موضوعات کا دائرہ فلسطین کی جنگ آزادی تک لے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں فلسطین کی آزادی کی تحریک کا بیان بھی ملتا ہے۔ فلسطین جو مسلم ملک ہے اور وہاں کے مقامات سے مسلمانوں کو مذہبی عقیدت بھی ہے اس لیے اسرائیل جو دیگر غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ مل کر فلسطین کے لوگوں پر وہاں کی زمین تنگ کر رہا ہے اُسے وحشت و بربریت کا نشانہ بنا رہا ہے اُس حوالے سے انتظار حسین کے افسانے "شرم الحرم" اور "کانا دجال" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

انتظار حسین مذہبی روایات، داستانوں، اساطیری عناصر کی مدد سے اپنے افسانوں کی فضا تیار کرتے ہیں۔ افسانے میں وہ 'دجال' کے فتنے کا جو قرآن کریم میں ذکر آیا ہے اس حوالے سے اپنے افسانے کی بُنت کرتے ہیں۔ دجال ایسا فتنہ ہو گا جس کی ایک آنکھ ہو گی اور اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی خاص صفات عطا کی جائیں گی جو انسانوں میں نہیں ہوں گی۔ اس لیے انسان اُس کے محتاج ہوں گے۔ ادھر یہودیوں کی جو فوج فلسطین پر ظلم و ستم کر رہی تھی اُس کا جرنیل "موشے دایان" بھی ایک آنکھ سے محروم تھا۔ اسی مناسبت سے کہ جرنیل دایان فلسطینوں پر ظلم و ستم کرنے میں پیش پیش تھا وہ بھی ایک آنکھ سے معذور تھا تو انتظار حسین نے اُسے دجال کہا ہے۔ ادھر انتظار حسین کے سادہ لوح کردار اس جرنیل کو ہی دجال تصور کیے بیٹھے ہیں۔ فلسطین کی حالتِ زار کا بتانے کے لیے انتظار حسین نے یہاں ایک پاکستانی گھرانے کے حوالے سے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ افسانے کے بزرگ کردار ابا جی اور اماں جی ہیں۔ اماں جی ایسا حب الوطن کردار ہیں کہ انھوں نے تحریک خلافت کے لیے مولانا محمد علی جوہر کی تقریر سے متاثر ہو کر اپنے سونے کے کڑے خلافت فنڈ میں جمع کروا دیئے تھے۔ ابا جی کا جذبۂ قومی بھی اماں جی سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں تھا۔ وہ خاصے مذہبی تھے اور عربی زبان سے بھی واقف تھے۔ مسلمانوں اور خاص طور سے فلسطین کے مسلمانوں کے لیے اُن کے دل میں دردمندی کے جذبات تھے۔ جب عرب اور اسرائیل پوری شدت سے لڑ رہے تھے تو ابا جی اس جنگ کے حالات سننے کے لیے بے چین رہتے۔ تمام پاکستانیوں کی طرح ابا جی بھی اس جنگ میں عرب کی پسپائی سے خاصے دل گرفتہ ہوئے تھے کہ عرب ہی وہ مقامِ خاص تھا جہاں سفر معراج کے آسمانی حصے کا آغاز ہوا تھا۔ اس لیے ابا جان کو اس ملک سے خاص مذہبی جذباتی وابستگی تھی۔

یہ دونوں بزرگ کردار مسلمانوں کی حالت سے خاصے رنجیدہ ہیں اور جب ابا جی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو اُن کے دکھ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ یہ کہتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہو جاتے ہیں کہ "جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے وہاں ہم پست ہو گئے۔" (۲۴) افسانے کا تیسرا کردار محسن میاں ہے جو ابا جی کا بیٹا ہے۔ ماں جی کا محسن کو "نئی روشنی والا" کہنا دراصل اس حقیقت کی علامت ہے کہ نوجوان نسل جدید انگریزی تعلیم کی پروردہ ہے اور اپنے مذہبی، سیاسی، فکری اور تہذیبی رشتوں کی قدر کرنے سے عاری ہے۔ اس لیے محسن میاں کا دکھ ابا جی اور اماں جی سے قدرے مختلف ہے: "بیٹے! تم نئی روشنی والوں کے لیے یہ ہنسی کی باتیں ہیں مگر غور کرو تو اس میں عبرت کی باتیں چھپی ہوئی ہیں، ہمارے رسول ﷺ اور آئمہ کو سب کچھ معلوم تھا کہ آگے چل کر کیا کیا ہو گا۔" (۲۵) افسانے میں پاکستانیت کا اظہار قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہوا ہے۔ تحریک خلافت تحریک پاکستان کا

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

ایک خاص موڑ تھا۔ جب مسلمانوں نے ترکی کے لیے اپنے جذبہ قومیت کو اجتماعی سطح پر منظم کیا مگر اب فلسطین کے لیے کوئی بھی اس سطح کی بغاوت نہ کر سکا۔ اس حوالے سے یہ افسانۂ لمحہ فکریہ ہے کہ پاکستان اپنے دوسرے مسلمان ممالک کی صرف جذباتی حوالے سے مدد کر رہا ہے۔ اسی طرح افسانہ "شرم الحرم" عرب اسرائیل کے حوالے سے نمایاں ہے[۲۶] میں دو دوست فلسطین کے مسئلے کو اجاگر کرتے ہوئے یہ باور کراتے ہیں کہ یہ تمام امتِ مسلمہ کا مسئلہ ہے۔ افسانے کے دونوں کردار صحافی ہیں۔ مصطفی فائق کا تعلق فلسطین سے ہے اور امین کے حوالے سے کسی حد تک مصری ہونے کا شائبہ ہے۔ مصطفی قاہرہ ریڈیو کی خبریں انگریزی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہے۔ یروشلم کے پسپا ہونے پر مصطفی کا گھر بھی غیروں کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انتظار حسین اپنے افسانوں کی بنیاد پاکستانیت کے تاریخی و سیاسی عنصر پر رکھتے ہیں۔ وہ ان عناصر کے حوالے سے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اُن کے افسانے ہمارے ماضی کے ترجمان اور حال کی مایوسی میں گھرے صورت حال پر افسردہ ہیں تو یہ اُن کے حب الوطن ہونے کا ثبوت ہے کہ اُس ارضِ مقدس سے اُن کا مضبوط رشتہ ہے انھیں جو اس کی فکر میں گھلائے دے رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عارف عبد المتین: امکانات، لاہور: ٹیکنیکل پبلشرز، ۱۹۷۵ء، ص ۱۶۹

۲۔ انتظار حسین: آخری آدمی، لاہور: کتابیات، ۱۹۶۷ء، ص دیباچہ

۳۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر: جدید اردو افسانے کے رجحانات، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء، ص ۲۶۵، ۲۶۶

۴۔ انتظار حسین،: گلی کوچے: لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۸، ۱۳۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۶۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۷۔ ممتاز شیریں: معیار، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۵۲

۸۔ ایضاً، ۶۸

۹۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۰۔ نعیم نقوی، ڈاکٹر: تنقید و تناظر، کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۴۷، ۳۴۶

۱۱۔ انتظار حسین: شہر افسوس، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲
۱۲۔ انتظار حسین: شہر افسوس، ص ۲۰۸
۱۳۔ اشتیاق احمد (مرتب): مضامین و مکالمات، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۶
۱۴۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: افسانے کا منظر نامہ، لاہور: مکتبۂ عالیہ، س ن، ص ۹۱
۱۵۔ انتظار حسین: شہر افسوس، ص ۱۳۵
۱۶۔ انتظار حسین: آخری آدمی، ص دیباچہ
۱۷۔ ڈاکٹر شفیق انجم، اُردو افسانہ، ص ۲۶۰
۱۸۔ ایضاً، ص ۶۱
۱۹۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر: اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء، ص ۴۹۶
۲۰۔ انتظار حسین: آخری آدمی، ص ۱۷۸
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۷۷
۲۲۔ ایضاً، ص ۶۷
۲۳۔ ایضاً، ص ۴۵
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱۳
۲۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲
۲۶۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: افسانے کا منظر نامہ، لاہور: مکتبہ عالیہ، س ن، ص ۹۱